(غلام گردش)

امریکہ اور آدھا سچ

عمومی رویوں کے متضاد سوچنا اور لکھنا قدرے مشکل کام ہے۔مگر ریاستوں کے باہمی معاملات دو جمع دو، چار نہیں ہوتے۔اکیسویں صدی میں ملکوں کے باہمی تعلقات حد درجہ مشکل اور پیچیدہ بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں۔کئی بار تو یہ جہتیں عام لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔پاکستان اور امریکہ کے تعلقات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔انتہائی پیچ دار مگر باہر سے سادہ سے نظر آتے ہوئے امور۔

ڈونلڈ ٹرمپ کی تقریر بے حد سنجیدہ تھی۔اسکا ایک ایک لفظ نپا تلا تھا۔جن اداروں کو پیغام دیا جا رہا تھا، وہ اسکو غور سے سن رہے تھے۔تقریر کا لبِ لباب صرف یہ تھا کہ دہشت گردی کی جنگ میں ہمارے ملک کی کیا پوزیشن ہے۔کوئی ہے بھی کہ نہیں۔امریکی صدر کو ہمارے ملک میں عمومی سطح پر کافی حد تک منفی پذیرائی حاصل ہوئی۔یہ ایک سادہ سا ردِعمل تھا اور ہر ملک میں ایسا ہی ہے۔اگر امریکہ ،ایران کے متعلق پابندیوں کی بات کرتا ہے، تو لازم ہے کہ ایرانی عوام میں اسکے خلاف ایک مشکل جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اگر ڈونلڈ ٹرمپ، ہمسایہ ملک میکسیکو کے بارے میں سرحدی دیوار کی بات کرتا ہے، تو میکسیکو میں عام لوگوں کی سطح پر امریکہ کے متعلق شدت پسندانہ جذبات اُبھرتے ہیں۔پاکستان کا بھی یہی عالم ہے۔مگر دنیا کے تمام ممالک ایک طرف اور ہمارا عمل اور ردِعمل جوہری طور پر یکدم ایک طرف۔جذباتیت اور ایک مشکل جذبے سے معمور۔اسے حب الوطنی کا نام دینا بھی قدرے غیر صائب ہے۔کیونکہ دلیل پر مخالفت یا تعریف بالکل ایک اور چیز ہے۔مگر صرف اور صرف وقتی جذبے کو بڑھا کر نعرے لگانے کا عمل بالکل ایک مختلف سانحہ ہے۔بدقسمتی سے ہم امریکی صدر کی تقریر کو اس سنجیدگی سے نہیں لے رہے، جسکی وہ مستحق ہے۔یہ ایک طرح کی چارج شیٹ بھی ہے جس میں ہمیں دہشت گردی کی جنگ میں ایک ولن کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔نکتہ یہ بھی ہے کہ اب تک اتنے عفریب دیکھ چکے ہیں کہ مصیبتوں اور بلاؤں کی عادت سی ہوگئی ہے۔ملک کے کسی حصے میں بم دھماکہ یا خودکش حملہ ہوتا ہے، تو اب اکثر لوگوں کیلئے یہ محض ایک خبر ہے۔ٹی وی پر سائرن بجاتی ہوئی ایمبولینس، نزدیکی ہسپتالوں میں ایمرجنسی کا خودساختہ سا اعلان، واردات کے بعد ہائی سیکیورٹی الرٹ اور مارے جانے والے افراد کی مالی معاونت، اس طرح کے معاملات اب ہمارے لیے بالکل عام سے ہیں۔ایک ایسی خبر جو دو چار دن میں مکمل طور پر ذہن سے غائب ہو جاتی ہے۔امریکی رویہ کے بدلنے سے ہمارے ملک پر جو ممکنہ قیامت ٹوٹ سکتی ہے، اس میں بھی ہم لوگ روایتی بے حسی کا مجسم غیر فعال رویہ اپنا بیٹھے ہیں۔خوفناک بات یہ ہے کہ عام سطح پر بے بسی اور بے حسی گڈمڈ ہو چکے ہیں۔سنجیدہ معاملات پر غور و غوض کرنے کیلئے اب شائد کوئی تیار ہی نہیں ہے۔طالبعلم کی رائے میں امریکہ سے کشیدگی کے معاملات ہمارے پورے ملک کو شدید عدم استحکام کی طرف لے جا سکتے ہیں۔یہ بات لکھنا بھی مشکل ہے اور اسکی پذیرائی تو خیر بے حد مشکل ہے۔

مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر حقیقت بیان کرنے کی عملی کوشش کریں تو آپکی حب الوطنی پر بھی سوال اُٹھایا جاتا ہے۔مگر میرا گمان ہے کہ اب ہمارے مقتدر ادارے بھی سامنے کھڑے ہوئے عفریب سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔دور کا ذکر نہ کیجئے۔عمومی طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ

امریکہ نے پاکستان کو افغانستان جہاد میں جھونک دیا اور پھر غائب ہو گیا۔ یہ بات صرف اور صرف آدھا سچ ہے۔ اگر امریکہ نے پاکستان کے خطہ کو سویت یونین کے خلاف استعمال کیا، تو کیا یہ ہماری مرضی کے بغیر تھا۔ قطعاً نہیں، ہرگز نہیں۔ تلخ بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق سیاسی تنہائی کا شکار تھا۔ جنرل ضیاء کو اندر سے احساس تھا کہ عالمی سطح پر اسکے کوئی قابل بھروسہ دوست نہیں ہیں۔ جنرل ضیاء اور اسکے رفقاء نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت امریکی جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ جہاد کا نعرہ ہمارا ایمان بنا دیا گیا۔ ہماری حکومت کی مرضی اور معاونت سے پوری دنیا سے جہادی اس خطے میں لائے گئے اور اسکے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہمیں استعمال کر کے چھوڑ دیا گیا۔ صاحبان! ہم اپنی مرضی سے استعمال ہوئے۔ ذاتی اور اداروں کی سطح پر بھرپور مال بنایا اور سنگین ترین بات یہ ہے کہ جو سینئر حکام اس جہاد کے بانی تھے، انکی اولاد اور مال سب کچھ امریکہ یا مغرب میں منتقل ہو گیا۔ ذاتیات پر بات نہیں ہونی چاہیے۔ مگر کیا ستتر کی دہائی کے عمال آج اپنے اثاثوں کی منی ٹریل دے سکتے ہیں۔ ناممکن۔ بات تلخ ہو جاتی ہے پر مجھے ڈیلس میں سینکڑوں ہم وطن ملتے ہیں جنہوں نے افغان جہاد میں خوب گنگا جل میں ہاتھ دھوئے بلکہ ڈبکیاں لگائیں۔ غریب کے بچے کیلئے بندوق اور جہاد لازم تھا مگر امیر اور مقتدر لوگ اس عظیم جہاد کے درمیان یا اختتام میں مغرب میں سینگ سما گئے۔ یقین نہیں آتا تو ماضی کے اہم لوگوں کی فہرست بنائیں۔ تحقیق کیجئے کہ آج کل کہاں ہیں اور انکی اولاد کہاں رہ رہی ہے۔ پورا سچ آپکے سامنے آ جائیگا۔ آج بھی اگر آپ کھل کر بات کریں کہ ہمارا افغانستان میں آلہ کار بننے کا فیصلہ مکمل طور پر غلط تھا، تو لوگ آپ کو غیر محبّ وطن سمجھ سکتے ہیں۔ امریکہ پر ہی بات کیجئے۔ کیا جنرل پرویز مشرف کا ذاتی فائدے کیلئے افغانستان کی حکومت کو برباد کرنے کا فیصلہ قطعی طور پر درست تھا؟ اسکے متعلق بھی سوالات موجود ہیں۔ ہم بری الزمہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ غور کیجئے۔ یہی توجہ طلب جزو ہے اور تحریر کا جوہر بھی۔

ہمارے ملک میں امریکہ کی مالی معاونت کو پرکھیے۔ جتنا مالی فائدہ پاکستان نے اس امداد سے اُٹھایا ہے، وہ حیرت نگری ہے۔ الگ بحث ہے کہ اس مالی معاونت سے ہم نے حقیقت میں کیا ترقی کی۔ یہ تکرار کسی اور وقت۔ امریکہ چلے جایئے۔ ہر شہر، قصبے اور دیہات میں پاکستانی نظر آئینگے۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں ہمارے شہریوں نے وہاں بے حساب ترقی کی ہے۔ کاروبار کیے۔ پیسہ بنایا۔ اعلیٰ نوکریاں حاصل کی ہیں۔ ہمارے بینکر، ڈاکٹر، انجینئر اور آئی ٹی کے شعبہ کے لوگوں کو امریکہ میں حد درجہ ترقی کے مواقع ملے ہیں۔ اپنے ملک میں ان لوگوں کو ترقی کے مساوی مواقع ہرگز ہرگز فراہم نہیں تھے۔ اس بات کو اُلٹا کر دیکھیے۔ پاکستان میں کتنے اہلیت والے غیر ملکیوں کو اپنے نظام کا حصہ بنایا ہے۔ ایک بھی نہیں یا شائد بہت کم۔ مجموعی طور پر لائق لوگوں کو یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج کی صورتحال تو خیر بے حد مشکل ہے۔ کوئی پتہ نہیں کہ آپ کے بیانیہ کو کیا رنگ دے دیا جائے۔

امریکی صدر کی تقریر کے بعد ایک تکلیف دہ جذباتی رویہ سامنے آیا ہے۔ اکوڑہ خٹک سے تعلق رکھنے والے مذہبی رہنماؤں نے فلک شگاف طریقے سے پریس کانفرنس کی ہے کہ حقانی گروپ کو ریاستی ادارے نشانہ نہیں بنا سکتے یا بنانا نہیں چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا صاحبان کی پریس کانفرنس کے بعد ہمارا قومی مقدمہ حد درجہ کمزور ہو چکا ہے۔ چند جید علماء اس الزام کو تسلیم کر رہے ہیں، جو ان پر تقریر میں لگایا گیا ہے۔ ملک دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایک مولانا صاحب فرما رہے ہیں کہ ہم امریکہ کے خلاف احتجاج کرینگے۔ درست

بات ہے۔مدرسوں سے ہزاروں طالبعلم باہر نکال کر جلوس نکالینگے۔مگر اس سے امریکہ کی صحت پر کیا اثر ہوگا۔اس سوال کا جواب وہ قطعاً نہیں دے سکتے۔تمام دینی رہنما گرمیوں میں اپنے مریدین سے چندہ وصول کرنے کیلئے مغربی ممالک جاتے رہتے ہیں۔ہر طرح سے عیش وآرام میں غیر سرکاری چھٹیاں گزارتے ہیں۔واپس آکر لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ان دینی قومی رہنماؤں سے پوچھیے، کہ آپ میں سے کسی ایک نے بھی ٹرمپ کی تقریر کے بعد امریکی سفارت خانے کو کہا ہے کہ میرا ویزہ کینسل کردیں۔ایک نے بھی کہا۔مگر لوگوں میں ایک تاثر پیدا کیا جارہا ہے کہ ہماری قومی غیرت اور ہمیت خطرے میں ہیں۔ان لوگوں کے دوعملی معاملات رہنے دیجئے۔اگر امریکہ اتنا ہی برا ہے تو اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے سامنے روزانہ ہزاروں لوگوں کی ویزہ حاصل کرنے کیلئے قطاریں کیوں لگی ہوئی ہیں۔وہاں جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر کوئی امریکہ جانے کیلئے بے قرار ہے۔کیا امریکی صدر کی تقریر کے بعد وہاں جانے والے پاکستانی شہریوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔قطعاً نہیں۔لوگ آج بھی وہاں قطاروں میں لگ کر انتظار کرنے کیلئے تیار ہیں۔بنیادی وجہ یہی ہے کہ عام لوگ،سرکار کے بیانیے سے عملی طور پر متفق نہیں ہیں۔وہ بات نہیں کرتے مگر ہر قیمت پر مغرب یا امریکہ پہنچنا چاہتے ہیں۔اگر ہماری قومی غیرت کو للکارا گیا ہے،تو کیوں کروڑوں لوگ اپنے وطن سے بھاگنے کیلئے تیار ہیں۔جواب دیجئے۔

دوسری طرف آیئے۔بتایا جارہا ہے کہ چین ہمارے ملکی مفادات کی حفاظت کریگا۔یہ بات بہت حد تک مبالغہ ہے۔چین صرف اور صرف اپنے قومی مفادات کی حمایت کریگا۔چینی حکومت نے پاکستان کو بے حساب پیسے دیے۔مگر انکی شرائط کیا ہیں،اس میں سے اکثریت قرضوں کی ہیں۔جو ہم نے واپس کرنے ہیں۔روس کی بات بھی کی جارہی ہے۔اسکی اپنی اقتصادی حالت اتنی خراب ہے کہ گنجائش ہی نہیں ہے کہ دل کھول کر ہمارے ساتھ کھڑا ہوجائے۔ہم جن متضاد معاملات میں پھنس چکے ہیں۔اس میں کوئی ملک ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ہمیں تو غیر ملکی صائب مشورہ بھی ناگوار گزرتا ہے۔جیسے کشمیر کے متعلق چینی رہنما ہمیں سمجھاتے رہے ہیں کہ چند دہائیوں کیلئے اسے پسِ پشت ڈال دیں۔اقتصادی ترقی پر توجہ دیں۔ملک کے مالی حالات درست کریں۔مگر ہم انکے مشورہ پر اپنی روش بدلنے کو توہین سمجھتے ہیں۔

اس وقت انتہائی ٹھنڈے طریقے سے اپنے قومی مفادات کا دوبارہ احاطہ کیا جانا چاہیے۔بے شک جو مرضی ہوجائے،ان مفادات کی تکمیل کیلئے حد درجہ غیر مقبول فیصلے کرنے پڑیں تو کرنے چاہیے۔صرف اور صرف ایک نکتہ اہم ہے کہ ہمارے مفادات کیسے محفوظ کیے جاسکتے ہیں۔امریکہ کے معاملے میں سفارتی دورے منسوخ یا تبدیل کروانے سے بہتر ہے کہ ہمارے مقتدر ادارے امریکہ کے ساتھ سنجیدہ مکالمہ کریں۔انکے خدشات اگر درست ہیں تو دلیل کی بنیاد پر اپنی قومی پالیسی کا ازسرِنو جائزہ لیں۔کسی صورت میں معاملات کو خلفشار اور جذباتی عناصر کے نزدیک نہ جانے دیں۔مگر ہم لوگ صرف آدھے سچ کو حقیقت گردانتے ہیں۔پورا سچ برداشت کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔